شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک*

جناب محمود الحق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جہاں تک اس مسئلہ کا الہیاتی پہلو ہے شیخ محمد عبدہ پرانے متکلمین کی لفظی موشگافیوں اور ان کی لاحاصل بحثوں سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اس مسئلہ پر افراط و تفریط سے بچنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا کہ متقدمین نے اس مسئلہ پر طول طویل بحثیں کی ہیں لیکن ان تمام بحثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نقطۂ آغاز سے آگے نہ بڑھ سکے[1] جہاں تک اس مسئلہ کا عملی پہلو ہے اس کی بابت انہوں نے کہا کہ ہر صحیح العقل انسان کو اس بات کا علم ہے کہ وہ اپنے افعال کو آزادی سے کر سکتا ہے اور ان کے انجام کو اپنی عقل سے سمجھ سکتا ہے۔ ایک قادر مطلق کے احساس کے باوجود انسان کو اپنے ارادۂ آزاد کا شعور ہے[2] وہ "رسالۃ الواردات" میں لکھتے ہیں کہ جس طرح عبد 'فاعل' ہے اسی طرح خدا 'فاعل' ہے اور جس طرح خدا فاعل ہے اسی طرح عبد فاعل ہے[3]

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہ ایک اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مذہبی حدود میں رہتے ہوئے عقیدۂ جبر کا ایک گونہ اقرار ضروری ہے۔ اس سے کوئی مذہب مستثنیٰ نہیں ہے (قادر مطلق کے احساس کی موجودگی میں انسان کا ارادۂ اختیار ہیچ نظر آتا ہے) چنانچہ ایک عیسائی مصنف ہانوتو کے جواب میں انہوں نے کہا یہ صحیح ہے کہ اسلام میں بعض باتیں ایسی ہیں جو انسان کو عقیدۂ جبر کی طرف لے جاتی ہیں۔

---

[1] محمد عبدہ۔ التوحید ۶۱

[2] ایضاً ۵۹، ۶۴

[3] فاللہ فاعل من حیث العبد فاعل، والعبد فاعل من حیث الرب فاعل، والوجود فی جمیع مراتبہ مختار۔ ۱۲

* مجلۂ علوم اسلامیہ ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شکریہ کے ساتھ یہ مضمون نقل کیا جاتا ہے۔ (مدیر) پہلی قسط ملاحظہ ہو الرحیم دسمبر ۱۹۶۵ء میں۔

لیکن کونسا مذہب ایسا ہے جس میں یہ باتیں نہیں ہیں۔[1]

عقیدہ جبر و اختیار کی طرح مسئلہ "حسن و قبح" بھی تاریخ اسلام کا ایک نازک مسئلہ ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنی مشہور تصنیف "رسالۃ التوحید" میں اس مسئلہ پر قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ان کی پوری تعلیمات کا غالب رجحان ہے۔ یہاں بھی انہیں اس مسئلے سے اسی حد تک دلچسپی ہے جس حد تک کہ اس مسئلہ کا تعلق انسانی اخلاق سے ہے ان کے خیال میں ہر انسان کے اندر اشیاء کے خیر و شر کی تمیز کی صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ مثلاً "حسن" کا احساس مسرت اور محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے جب کہ "قبح" سے نفرت یا خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح انسان محسوسات میں خیر و شر کی تمیز کر سکتا ہے اسی طرح معقولات میں بھی خیر و شر کی صلاحیت ادراک انسانی میں موجود ہے۔[2]

شیخ محمد عبدہ "رسالۃ التوحید" میں عام متکلمین کی طرح لفظ "حسن" کو تین خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔[3]

(۱) ایک معنی میں حسن کمال ہے اور اس کا نقص "قبح" ہے چاہے اخلاقی امور سے متعلق ہو یا عقلی امور سے۔ حسن دوسرے معنی میں "ملائمت" ہے خواہ اس کا تعلق طبیعت سے ہو یا کسی ایسے مقصد سے جسے عقل حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جہاں تک کسی چیز کی طبیعت یا مزاج سے "ملائمت" کا تعلق ہے تو اس میں وہ چیزیں داخل ہیں جن سے ہم لذت محسوس کرتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے "حسن و قبح" کی تمیز کے سلسلہ میں مخلوقات میں انسان اور درجۂ اعلیٰ کے حیوان کے درمیان بہت کم تفاوت ہے۔ جہاں تک کسی چیز کا ان اغراض یا مقاصد سے "ملائمت" کا سوال ہے جنہیں عقل حاصل کرنا چاہتی ہے تو یہ "نافع" ہے اپنے وسیع معنوں میں۔ اور "منفعت" کی غرض سے انسان کسی چیز کی قدر و قیمت کے بارے میں جو حکم لگاتا ہے وہ "عمل عقلی" ہے جیسے جیسے انسان ترقی کرتا جاتا ہے وہ "لذیذ" کے مقابلہ میں مفید کو ترجیح دیتا ہے اور اس کے لئے ایثار

---

[1] "نعم إن فی الاسلام لبعض نزعات تنحوالی تقییدالحریۃ ولکن این الدین الذی خلا من تلک النزعات" رشید رضا: تاریخ ۲: ۲۱م

[2] التوحید ۹۵

[3] ایضاً ۷۶-۷۹

وقربانی سے کام لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں "حسن" سے مراد وہ انسانی افعال ہیں جن میں فرد یا جماعت کیلئے "منفعت" پوشیدہ ہو۔ اگرچہ وہ کام دشوار ہو اور اس کے کرنے میں طبیعت کو ناگواری ہو یا کراہیت محسوس ہو[1] (۳) تیسرے معنی میں "حسن" کا اطلاق کسی امر کے "ممدوح" و "مذموم" ہونے پر ہوتا ہے۔

جملہ متکلمین، اشاعرہ و معتزلہ اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ اوّل الذکر دو معنوں میں عقل "حسن" کا ادراک کر سکتی ہے۔ لیکن تیسرے معنی میں متکلمین کا آپس میں شدید اختلاف ہے۔ یہ اختلاف محض لفظی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ دور رس فلسفیانہ نتائج کا حامل ہے۔ اشاعرہ کا مسلک یہ ہے کہ کوئی شئے بنفسہ "حسن" یا "قبیح" نہیں ہے اور نہ اشیاء کی اپنی خواص و تاثیر ہیں۔ "حسن" وہ ہے جسے شارع نے "حسن" کہا ہے اور "قبیح" وہ ہے جسے شارع نے "قبیح" کہا ہے۔ اس کے برعکس معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ ہر شے پہلے سے "حسن" یا "قبیح" ہے اور یہ غلط ہے کہ شارع جس چیز کو "قبیح" کہدیتا ہے "قبیح" ہو جاتی ہے بلکہ شارع اسی چیز کو "حسن" کہتا ہے جو فی نفسہ "حسن" تھی اور اسی چیز کو قبیح کہتا ہے جو پہلے سے "قبیح" تھی۔ ظاہر ہے کہ اشاعرہ کا مسلک عقیدۂ جبر سے بہت قریب ہے۔ اگرچہ انہوں نے "کسب" کے نام پر "جبر" و "اختیار" کے بیچ میں ایک تیسری راہ نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی یہ کوشش لفظی موشگافیوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ شیخ محمد عبدہ جو اصلاحی تحریک کے علمبردار ہیں، اشاعرہ کے اس منفی مسلک کے قبول کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ نیم فلسفیانہ معتزلی نقطۂ نظر کو اپناتے ہیں اور فارابی (۹۵۰ء) و ابن رشد (۱۱۹۸ء) جیسے جلیل القدر مسلم فلاسفہ کی رہنمائی قبول کرتے ہیں۔ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز کی صلاحیت انسان کے اندر فطرتاً موجود ہے۔ اس کے لئے کسی شریعت یا عُرف کی ضرورت نہیں ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے یہ بات صراحتاً کہی کہ خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت ادراک انسانی میں فطرتاً موجود ہے جس کی بنیاد پر وہ خود اعمال و افکار یا ان اعمال و افکار کے نتائج کے بارے میں "حسن" یا "قبیح" ہونے کا فیصلہ صادر کرتا ہے[2]۔ اس سلسلے میں وہ ایک اہم اور معنی خیز بات کہتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اشیا کا حسن و قبح مستقل بالذات ہے اور شریعت کا کام یہ ہے کہ وہ امر حقیقت کو واضح کرتی ہے نہ کہ وہ "حسن" کو پیدا کرتی ہے[3]۔

---

[1] التوحید ۶۹-۷۰ [2] اور [3] حاشیہ صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہ اس منطقی نتیجے تک پہنچے ہیں کہ صاحب عقل و بصیرت الہام کے بغیر بھی اخلاق کا صحیح ضابطہ معلوم کر سکتے ہیں[۴]۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ محض نظری حد تک محدود نہیں ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ تاریخ ایسے اعیان سے خالی نہیں جنہوں نے محض عقل پر اعتماد کرتے ہوئے اخلاق کا صحیح ضابطہ معلوم کر لیا تھا۔ اگرچہ ایسی برگزیدہ ہستیاں بہت کم گذری ہیں[۵]۔ یہاں شیخ محمد عبدہ حریت فکر کی اس منزل تک پہنچ جاتے ہیں جہاں عقل انسانی ہر طرح کی بندشوں سے آزاد ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور مذہب کی پابندیوں سے بکسر آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اگلا قدم فکر کی آزادی کو بہت حد تک محدود کر دیتا ہے وہ ایک سچے مسلمان کی طرح تنہا عقل کی رہنمائی کو کافی نہیں سمجھتے اور انبیا کی ہدایات کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی کردار کی تشکیل میں مذہب فیصلہ کن عوامل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۷) ۲ محمد عبدہ کے الفاظ ہیں - فللأعمال الإختيارية حسن وقبح نفسها أو باعتبار أثرها في الخاصة أو في العامة. والحس أو العقل قادر على تمييز ما حسن منها وما قبح بالمعاني السابقة بدون توقف على سمع، والشاهد على ذلك ما نراه في بعض أصناف الحيوان، وما نشهده في أفاعيل الصبيان قبل تعقل ما معنى الشرع وما وصل إلينا من تاريخ الإنسان وما عرف عنه في جاهليته"۔ التوحید ۷۱-۷۲

۳ إنما جاء الشرع مبيناً للواقع، فهو ليس محدث الحسن"۔ رسالۃ التوحید ص ۸ "حسن و قبح" کی بڑی ایک قدیم بحث ہے۔ اس سوال کو سب سے پہلے افلاطون نے **Euthyphro** میں اٹھایا تھا۔

"Is it right because gods commend it, or do the gods commend it because it is right"

۴ "فالناس متفقون على أن من الأعمال ما هو نافع ومنها ما هو ضار، وبعبارة أخرى منها ما هو قبيح، ومن عقلائهم وأهل النظر الصحيح والمزاج المعتدل منهم من يمكنه إصابة وجه الحق في معرفة ذلك"۔ التوحید ۷۶

۵ ...... الهم إلا في قليل ممن لم يعرفهم الزمن .... التوحید ۷۷

خود مذہب کے متعلق شیخ محمد عبدہ کا تصور یورپ کے نظریۂ ارتقا سے متاثر ہے ان کے خیال میں مذہب تاریخی طور پر بتدریج پستی سے بلندی اور عدم کمال سے کمال کی جانب بڑھتا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فرد کی طرح معاشرہ بھی اپنی نشو و ارتقا میں کئی مرحلوں سے گذرتا ہے طفولیت کے مرحلے میں اس کو صرف اپنی جسمانی ضروریات اور اپنی حفاظت و تنظیم سے واسطہ تھا۔ اعلیٰ قدروں کے لئے اس کے پاس نہ تو وقت تھا اور نہ فرصت۔ یہ آلات (پیداوار) کی ترقی کی زمانہ ہے۔ پتھر سے تانبے اور تانبے سے لوہے تک۔ پھر صنعتوں اور فنون میں ترقی ہوتی ہے۔ اقوام کے متعلق بھی اللہ کی سنت وہی ہے جو افراد کے متعلق ہے یعنی ضعف سے قوت اور عدم کمال سے کمال کی جانب تدریجی ترقی۔ ترقی کے اس مرحلے میں انسان اپنے حواس کے تابع ان اندیشوں اور تخیلات کے زیر اثر تھا جن کو اس کے حواس نے پیدا کیا تھا۔ وہ مظاہر قدرت سے ڈرتا اور انہیں دیوتا بناکر پرستش کرتا تھا۔ لیکن انسان رفتہ رفتہ اپنے تجربات کے ذریعہ اجتماعی زندگی کے بعض اصولوں سے واقف ہوگیا۔ اس طرح شیخ محمد عبدہ کے نزدیک انسان طفولیت کے مرحلے سے نکل کر ذہنی ارتقا کی نئی منزل تک پہنچ گیا اور نبوت کے قبول کرنے کے قابل ہوا جسے وہ جوانی کے مرحلے سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا گیا مختلف ادیان وجود میں آتے گئے جن کی تعلیمات اس زمانے کی ذہنی صلاحیت کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ اسلام اس سلسلۂ ادیان کی آخری کڑی ہے یہ اس وقت ظاہر ہوا جب انسانی معاشرہ ارتقا کے انتہائی مدارج طے کر چکا تھا۔ [1]

مسلم معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں شیخ محمد عبدہ نے جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا وہ ہے عقلیت پسندی۔ دراصل یہ ان کی تحریک کا اساسی پہلو ہے۔ وہ کورانہ تقلید کو مسلمانوں کے جمود و تعطل

---

[1] التوحید ۱۶۶ — ۱۶۹ - اگرچہ بانی اسلام کے خاتم النبین ہونے پر عام مسلمان متفق ہیں پھر بھی متقدمین میں بعض نے اس عقیدہ کی مخالفت کی ہے مثلاً العجلی لکھتا ہے: إن رسل اللّٰہ لا ینقطعون أبداً۔ ملاحظہ ہو الشہرستانی: الملل والنحل ص ۲۰۳ بحوالہ عثمان امین: رائد الفکر ۱۳۷

کا بنیادی سبب سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ تقلید اور روایت پسندی ایک بیمار معاشرے کی علامتیں ہیں جن سے شفایاب ہوئے بغیر ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل ناممکن ہے وہ خود اپنے تجربے سے جانتے تھے کہ روایت پسندی کس طرح لوگوں کے دل و دماغ کو جکڑ لیتی ہے اور نئے خیالات کے لئے ہمیشہ سدِّ راہ ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے روایت پسندی کے قلعہ کو مسمار کرنا شروع کر دیا اور آزادی فکر کا علم بلند کیا[1] انہوں نے کہا کہ غور و فکر ہر ذی عقل انسان پر لازم ہیں۔ ان سے کسی کو مفر نہیں اس ذی عقل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے ارد گرد جو دنیا ہے اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کرے موجودات و اشیاء کی تحقیق و تفتیش کرے اور اس سلسلے میں اسے جو خصوصی وسائل حاصل ہوں انہیں استعمال کر کے اپنے موقف کو یقینی براھین پر قائم کرے اور صحیح استدلال سے کام لے[2] شیخ عبدہ نے کہا کہ مذہب ایک عام حاسہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ انسان اسباب فلاح کو تلاش کرے۔ جن کو عقل واضح طور پر نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن آخری اختیار صرف عقل کو حاصل ہے[3] ان کے نزدیک قرآن کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں بھی عقل کو کلی اختیار حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام کا دوسرا اصول ہے کہ جب کلام الٰہی کے لفظی معنی اور تقاضائے عقل کے درمیان اختلاف ہو تو عقل کے مطابق اس کی تاویل کرنی چاہیئے[4] جہاں تک اسلاف کی آرا کا تعلق ہے ان کی بابت وہ کہتے ہیں کہ حرف آخر ہونے کا حق نہ تو فرسودہ نصوص کو حاصل ہے نہ پرانے اختیارات کو جواب مٹ چکے ہیں اصل چیز زندگی اور اس کی ضروریات ہیں[5] غرض کہ شیخ محمد عبدہ کے نزدیک سلف صالحین کے احترام

---

[۱] تاریخ ۲ : ۱۱۳

[۲] تفسیر عم ۱۶۹

[۳] الدین ہو حاستہ عامۃ لکشف مایشتبہ علی العقل من وسائل السعادات والعقل ہو صاحب السلطان فی معرفۃ تلک الحالۃ" التوحید ۱۲۹

[۴] "یجب أن لاتکون الکلمۃ الآخرۃ للنصوص البالیۃ ولا للسلطات البائدۃ بل للحیاۃ النابضۃ ولروح التجدید وتوخی المصلحۃ العامۃ" التوحید ۱۰۸

[۵] التوحید ۱۰۸

کے نام پر عقل انسانی کی جولان گاہ کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اسلاف ہی اسلام کی صحیح تشریح کر سکتے تھے اور بعد کی نسلوں کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ "رسالۃ التوحید" میں اسلاف پرستی کا بطلان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا: خدا کے عطیوں میں تمام نسلیں اگلی اور پچھلی برابر کی شریک ہیں۔ جہاں تک زمانے کے اعتبار سے سبقت کا سوال ہے تو یہ نہ تو علم کا ثبوت ہے اور نہ عقل و فکر کی برتری کا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نئی نسلوں کو سابقہ نسلوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ معلومات کے جو ذرائع اب ہمیں حاصل ہیں ہمارے اسلاف ان سے محروم تھے۔

شیخ محمد عبدہ کبھی کبھی تقلید کی مذمت میں کافی شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ "شرح الدوانی" کے حاشیہ پر وہ تقلید کو کفر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ مقلد اصول دین کو عقل کے بغیر تسلیم کرتا ہے۔ اس لئے اسے درجۂ ایقان حاصل نہیں ہوتا اور جب تک اصول دین میں ایقان حاصل نہ ہو شک قائم رہتا ہے اور ایسا شخص کافر کہلانے کا مستحق ہے۔[1]

انہوں نے کہا کہ کافر وہ ہے جو حق کی روشنی دیکھتا ہے تو اپنی نظریں بند کر لیتا ہے اور جب صداقت کی آواز اس کے کانوں میں پہنچتی ہے تو اپنے کان بند کر لیتا ہے۔ وہ دلائل کی پروا نہیں کرتا بلکہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو تقلید میں مبتلا دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے اور ان کی طرح اسلاف کی اندھی تقلید میں لگ جاتا ہے۔[2]

---

[1] قد اجمع اہل التحقیق من کل طائفۃ، خصوصاً الشیخ الاشعری، علی أن المقلد فی اصول دینہ لیس بمستیقن، وکل من لیس بمستیقن فی الأصول فھو علی ریب فیھا وکل من کان کذلک فھو کافر" سلیمان دنیا: الشیخ محمد عبدہ بین الفلاسفۃ والکلامیین (مصر ۱۹۵۸) ۵۷۔

[2] الکافر المعاند الجامد الذی اذا رأی ضیاء الحق اغمض عینیہ واذا سمع الحرف من کلمتہ سد أذنیہ ذلک الذی لایبحث فی دلیل بعد عرضہ علیہ، ولایذعن لحجۃ اذا اخترقت فؤادہ بل یدفع جمیع ذلک حباً فیما وجد نفسہ فیہ مع الکثیر ممن حولہ واستند فی التمسک بہ إلی تقلید من سلفہ"۔ (المنار ا: ۳۷)

شیخ محمد عبدہ کے یہ افکار بہت ہی دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ فرانسیسی مصنف **Lacouture** محمد عبدہ کے ان افکار سے متاثر ہوکر لکھتا ہے: محمد عبدہ کی عقلیت پسندی اتنی ہی جوکھم والی تھی جتنی کہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں ہمارے ان مفکرین کی تھی جن میں سے بعضوں کو موت کا جام پینا پڑا۔[1]

شیخ محمد عبدہ کا اصرار تھا کہ عقیدہ کی بنیاد "صحیح استدلال" پر قائم ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ لوگ (علما) عقیدہ پہلے قائم کرلیتے ہیں پھر اس کے لئے استدلال ڈھونڈتے ہیں۔[2] اس کے علاوہ وہ "استدلال" میں "فکر کی خود مختاری" کے بہت زیادہ قائل تھے یہی وجہ ہے کہ وہ استدلالی علوم فلسفہ اور منطق کی خاص طور پر حمایت کرتے تھے جب کہ علمائے ازھر کے نزدیک یہ علوم بے حد ناپسندیدہ تھے غالباً جمال الدین افغانی پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے قیام مصر (۱۸۷۵ء) کے دوران میں ان علوم کے احیاء کی کوشش کی۔ انہوں نے سب سے پہلے ابن سینا کی "الاشارات" کا درس دینا شروع کیا جس کی وجہ سے مصر کے قدامت پسند علماء نے جمال الدین کو معتوب قرار دیا اور ان کے اس فعل کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا۔ شیخ محمد عبدہ نے ۱۸۷۷ء میں اپنے ایک مضمون میں علم منطق کی پر زور تائید کی اور کہا کہ یہ وہ علم ہے جو دلائل کی درستی پیدا کرنا سکھاتا ہے، انہوں نے علماء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اگر ہم اپنے فکر کو دلائل کی درستی کے لئے استعمال نہیں کرتے تو پھر ہم اسے اور کس مصرف کے لئے استعمال کریں گے۔[3] شیخ محمد عبدہ کے نزدیک فلسفہ اور منطق صداقت اور یقین کے حصول کے اہم ذریعے ہیں۔ منطق کو وہ فکر کا "معیار" اور میزان سے تعبیر کرتے تھے۔[4]

عقلیت پسندی کے اسی جذبہ کے تحت محمد عبدہ نے اپنے معاشرے کے جملہ نقائص پر سخت محاسبہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے جھوٹے فقہا، علما اور صوفیا کو بے نقاب کیا اور بھولے بھالے عوام کو ان کے چنگل سے نکالنے کی پوری کوشش کی۔ فقہا کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان فقہاء کی تاریخی حیثیت یہ رہی ہے کہ یہ ہر زمانے میں حکمران طبقہ کے آلۂ کار بن کر ان کے مفاد کی ترجمانی کرتے رہے

---

[1] Egypt in Transition (Eng. Trans.) London.

[2] فاکثرہم لیعتقد فیستدل، وقلما تجد بینہم من یستدل لیعتقد" (التوحید ۶۵)

[3] رشید رضا: تاریخ ۲: ۶۰

[4] ایضاً ۱: ۳۶

ہیں اور اس مقصد کے تحت "حیلہ شرعیہ" کے نام پر شریعت کی من مانی تاویلیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح طبقۂ علماء کے ذہنی افلاس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کے اذہان تحقیق و تمحیص کی روح سے خالی ہیں اور ان پر ہر طرح کے اوہام اور خرافات کا غلبہ ہے یہ وہ لوگ ہیں جو عام مسلمانوں کے دماغوں میں تقلید کا زہر گھولتے ہیں۔[1]

ان علماء کا علمی سرمایہ اصل متون کی جگہ شروح و حواشی تک محدود ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اس زمانے کے نہیں ہیں بلکہ اس دنیا کے رہنے والے ہی نہیں ہیں۔[2] اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک تجربہ بیان کرتے ہوئے محمد عبدہ نے کہا: جب ہم اپنے استاد کو پڑھاتے ہوئے سنتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی اجنبی زبان بول رہے ہیں۔[3] اپنے ایک مضمون میں انہوں نے لکھا: "ہمارے علماء کو جو قوم کے لئے بمنزلہ روح کے ہیں، آج تک علوم جدیدہ میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا اور وہ اب تک انہی مشاغل میں مصروف ہیں جو صرف پرانے اور متروک زمانے ہی کے لئے موزوں تھے۔ وہ اس حقیقت سے قطعاً غافل ہیں کہ ہم آج ایک نئی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔" علوم حاضرہ کے متعلق ان علماء کا رویہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا: علوم جدیدہ جو ہماری ضروریات زندگی میں شامل ہیں اگر ان کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو ہم اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اگر یہ وحشی حکمرانوں کا زمانہ ہوتا تو پھر بھی اس رویے کے حق بجانب ہونے کا کوئی عذر ہوتا۔ لیکن یہ ذہنیت آج کل کے زمانے میں کیوں کر چل سکے گی جب کہ علم پھیل رہا ہے اور دیگر متمدن ملکوں سے ہمارے روابط قائم ہیں۔"[4]

علماء و فقہاء کی طرح شیخ محمد عبدہ نے اپنے زمانے کے صوفیوں کی بھی خبر لی۔ اگرچہ وہ خود ابتدائی دور میں صوفی تھے[5] اور تاریخ اسلام میں صوفیوں کے رول کی تعریف کرتے تھے[6] لیکن ان کے زمانے میں دنیائے

---

[1] ایضاً ۱: ۴۹۶، ۵۰۶ وغیرہ

[2] رشید رضا: تاریخ ۱: ۱۱۴

[3] رسالہ المنار ۸: ۳۸۱

[4] رشید رضا: تاریخ ۲: ۳۷ - ۴۴

[5] ایضاً ۲: ۲۸۰ [6] تفسیر المنار ۱: ۲۱۷

اسلام میں نام نہاد صوفیوں کا جو کردار تھا اس سے وہ بہت نالاں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان صوفیوں نے مذہب کو حصول رزق کا ذریعہ بنا لیا ہے[۱]۔ یہ لوگ عوام میں بے عملی اور قنوطیت کی تلقین کرتے ہیں۔ بھولے بھالے عوام بہت جلد ان کے فریب اور شعبدوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا تصور کرنے لگتے ہیں۔ قرآنی آیت ۲: ۱۶۵: "ومن الناس من یتخذ من دون اللہ أنداداً یحبونہم کحب اللہ والذین آمنوا أشد حباً للہ ولو یری الذین ظلموا إذ یرون العذاب أن القوة للہ جمیعاً وأن اللہ شدید العذاب" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہ نے بتایا کہ عقیدہ پیر پرستی لوگوں کو بے عملی میں مبتلا کر دیتا ہے اور ان کے اندر سے اخلاقی ذمہ داری کا شعور ختم کر دیتا ہے۔ عوام اپنی حالت کے بہتر بنانے کے سلسلے میں مادی وسائل پر بھروسہ کرنے اور اسباب و علل کو معلوم کرنے کی بجائے کسی ولی یا فقیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنہیں وہ کائنات پر متصرف سمجھتے ہیں۔ اس طرح مسلم عوام دین کے ساتھ ساتھ اپنی دنیا بھی تباہ کرتے ہیں[۲]۔ ایک دوسرے موقع پر شیخ محمد عبدہ نے کہا کہ اولیا کے متعلق اس طرح کے عقیدے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ہر حادثے کو جو دراصل خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور اسے کسی صوفی یا ولی کا کرشمہ تصور کرنے لگتے ہیں۔ وہ غیر معمولی طبعی حوادث کو سمجھنے کی بجائے خوف سے کانپنے لگتے ہیں اور ہمیشہ انجانے خطرات سے ڈرتے رہتے ہیں[۳]۔

شیخ محمد عبدہ کے نزدیک ان سارے مفاسد اور برائیوں کا صرف ایک علاج ہے یعنی یہ کہ مسلمان قرون اولیٰ کی طرف واپس جائیں انہیں جو اسلام ترکے میں ملا تھا وہ صدیوں کے رطب و یابس کے جمع ہو جانے کی وجہ سے اس قدر وسیع اور پیچ در پیچ ہو چکا تھا کہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ان کی کوشش تھی کہ اقل قلیل عقائد واضح کئے جائیں۔ جن کے بغیر اسلام اسلام نہیں رہتا۔ انہیں ایسے بنیادی اسلامی عقائد کی ضرورت تھی۔ جو پائدار ہوں۔ اور محض مقامی و عارضی خصوصیات نہ رکھتے ہوں۔ اسی نقطۂ نظر سے وہ شریعت اسلامی[۴] میں ترمیم کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک برطانوی پادری کے جواب میں شیخ محمد عبدہ نے کہا کہ اگر

---

[۱] تاریخ ۲: ۳۴۳م

[۲] تفسیر المنار ۲: ۷۲

[۳] رسالۃ المنار ۶: ۹۰۲ [۴] اس سے مراد ظاہر ہے اسلامی کے تفصیلی قوانین ہیں۔ (مدیر)

اسلام کو اس کی سادہ ترین اور ابتدائی شکل میں لوٹایا جائے تو اسلام تمام بنی نوع انسان کے لئے قابلِ قبول ثابت ہو جائے گا، اور اس وقت یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ طلاق، تعدد ازدواج، غلامی اور اس قسم کے دیگر مسائل کے متعلق موجودہ اسلامی ضوابط اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ مسائل ہیں جن میں ضرورت پڑنے پر حالات کے تحت ضروری ترمیم کی جا سکتی ہے[۱]۔ ان کے نزدیک چونکہ شریعت کی اساس محبت انصاف اور مصلحت عامہ پر ہے اس لئے شریعت میں مسلسل تغیر کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام ہمیشہ مصلحت عامہ کے مطابق فیصلے صادر کرتے تھے، اور بعض دفعہ انہیں سنت نبوی کی خلاف ورزی بھی کرنی پڑتی تھی[۲]۔

شیخ محمد عبدہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جہاں تک اجتماعی روابط اور شہری و تجارتی معاہدات کے متعلق قواعد و ضوابط کا تعلق ہے ان کو مذہب سے کاملاً علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ اور انہیں کسی ایسے ضابطے کا لازمی جزو نہیں بنا دینا چاہیئے جو مقدس اور ناقابلِ تغییر قرار دیا گیا ہو۔ یہ قوانین بلاشبہ قرآن و سنت پر مبنی ہونے چاہئیں لیکن ان میں ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیلیوں کی گنجائش ہونی چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ قوانین انسانی مصلحت کے لئے بنائے جاتے ہیں اور مصلحت زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے[۳]۔

اسی مقصد کے تحت شیخ محمد عبدہ قرآن و حدیث کے نصوص کی خلاف ورزی کو بھی جائز سمجھتے ہیں[۴]۔ ان کے نزدیک شریعت کی تفصیلات کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اصل چیز اس کی روح ہے[۵]۔ انہوں نے

---

[۱] .. أن امثال هذه المسائل [كالطلاق وتعدد الزوجات والرق] لايعدها المسلمون من اصول الدين
تاریخ ۲ : ۵۸۴

[۲] رسالة المنار ۴ : ۲۱۵

[۳] رسالہ المنار ۴ : ۸۵۹ - إن الأحكام العملية .. تشرع لمصلحة البشر والمصلحة تختلف باختلاف الزمان ... » تفسير المنار ۲ : ۱۳۸

[۴] إن الشريعة الإسلامية، بما تقرر فيها من قاعدتى الاجتهاد ورعاية الأصلح كانت من الشرائع التى توافق كل زمان ومكان وتجيز لكل ضرورة حكما يوافق مقتضى المصلحة والحال وإن خالف النص .... » المنار ۱۳ : ۴۱

کہا "حاجت" بمنزلۂ "ضرورت" کے ہے اور ضرورت ممنوع چیزوں کو مباح کردیتی ہے اور کسی چیز کی "حاجت" یا "ضرورت" اسے متفق علیہ بنا دیتی ہے۔[۱]

اس زاویۂ نظر سے شیخ محمد عبدہ نے زندگی سے متعلق چند اہم شرعی مسائل کی جدید تشریح کی انہوں نے سیونگ بینک کے سود کی اباحت کا فتویٰ دیا۔ تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو جائز ٹھہرایا۔ جہاں تک موخرالذکر مسئلہ کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ احادیث صحیحہ میں ان کی ممانعت کا حکم صراحتاً موجود ہے۔ مثلاً ایک حدیث ہے۔ إن أشد الناس عذاباً یوم القیامة المصوّرون" (قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب کے مستحق مصورین ہوں گے) محمد عبدہ ان احادیث کی صحت سے انکار نہیں کرتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا جب بت پرستی رائج تھی۔ اب اس طرح کی کوئی مصلحت درپیش نہیں ہے اس کے علاوہ تصویر کشی کے فوائد مسلّم ہوچکے ہیں لہٰذا عارضہ کے زائل ہونے اور فائدہ کے ظاہر ہونے کے بعد حکم ممانعت زائل ہوجاتا ہے ایسی حالت میں ذی روح اور غیر ذی روح اشیا کی تصویر کشی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تصویر کشی ممنوع ہے اس لئے کہ اس سے بت پرستی کے پیدا ہونے کا امکان ہے اس کے جواب میں محمد عبدہ نے کہا ہے کہ یہ کہنا ایسا ہی ہے .... جیسے کوئی یہ کہے کہ چونکہ زبان سے جھوٹ کے سرزد ہونے کا امکان ہے اس لئے اسے باندھ دینا چاہیئے دراں حالیکہ انسان کی زبان سچ بولنے پر اسی طرح قادر ہے جس طرح جھوٹ بولنے پر۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ اسلامی شریعت کی روح کے خلاف ہے کہ وہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی کو ممنوع قرار دے جب کہ یہ علم حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔[۲]

اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں شیخ محمد عبدہ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جنسی مساوات کی طرف توجہ کی ان کا دعویٰ تھا کہ اسلام جنسی مساوات کا قائل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ جہاں تک عملی زندگی کا سوال ہے عورتوں کو یہ حقوق اب تک بہت کم حاصل ہوئے ہیں۔[۳] اس مسئلہ پر شیخ محمد عبدہ

---

[۱] دیکھئے تفسیر المنار وغیرہ

[۲] رشید رضا، تاریخ ۲: ۹۸ م

[۳] رسالہ المنار ۱۲: ۳۳۱

نے اپنے خیالات کو زیادہ آگے نہیں بڑھایا[1] لیکن آزادیٔ نسواں کے سلسلے میں شیخ محمد عبدہ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تعدد ازدواج کے خلاف آواز اٹھائی۔ جسے وہ غیر انسانی اور بہیمانہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام یک زوجگی کو مثالی نکاح سمجھتا ہے۔ انہوں نے قرآنی آیت ۳: ۴ فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة "کو بنیاد بناتے ہوئے کہا کہ تعدد ازدواج کے سلسلہ میں عدل کی شرط ایک ایسی شرط ہے جس کا پورا کرنا تقریباً ناممکن ہے، انہوں نے مزید کہا کہ اوائل اسلام میں تعدد ازدواج کی جو اجازت تھی تو اس کے کئی فوائد تھے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے معاشرے کی شیرازہ بندی میں مدد ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اس ادارے کی وجہ سے معاشرے میں کسی قسم کی برائی نہیں پیدا ہوتی تھی کیوں کہ دین لوگوں کے دلوں پر متمکن تھا۔ لیکن اب یہ صورت حال نہیں ہے اس زمانے میں تعدد زوجات کی برائیاں پوری طرح نمایاں ہو گئی ہیں اور یہ معاشرتی زندگی کی تباہی کا باعث ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس مسئلے پر نظر ثانی کی جائے[2] شیخ محمد عبدہ نے علمائے اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اسلام انسان کی بھلائی کے لئے آیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کی اس طبعیت کے تقاضے کے تحت اس بیہودہ رواج پر پابندی عائد کی جائے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اصولی شکل میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب کسی شئے سے مفاسد پیدا ہونے لگیں جو اس سے پہلے نہیں پیدا ہوتے تھے تو ایسی حالت میں واجب ہو جاتا ہے کہ اس شئے کی بابت حکم میں تبدیلی کی جائے اور اسے حالت حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے اس لئے کہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ مفاسد کی روک تھام

---

[1] کینٹول اسمتھ کا یہ کہنا صحیح ہے۔

"It is not at all surprising that sex should be about the last point on which a religion makes progress"

Islam in India (Lahore, 1947) P.35.

[2] تفسیر المنار ۴: ۳۴۸ - ۳۴۹

حصول مصالح پر مقدم ہے[1]

شیخ محمد عبدہ کے ان افکار نے مصر میں تحریک نسواں کے نشو و ارتقا کے لئے زمین ہموار کی اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصر میں تحریک نسواں کے سب سے بڑے علمبردار قاسم امین[2] (۱۹۰۸ء ۱۸۶۵ء) محمد عبدہ ہی کے شاگرد تھے۔

اگرچہ آج شیخ محمد عبدہ کے بعض افکار بے رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جس آزادانہ طریقے سے اسلامی شریعت کی تشریح و تاویل کی وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے یقیناً ترقی پسند ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مصر کے علمائے جامدین کس شد و مد سے شیخ محمد عبدہ کے ان ہی افکار کی مخالفت میں کمربستہ رہتے تھے جو آج ہمیں پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض تاریخی اسباب کی بنا پر محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک پروٹسٹنٹزم (PROTESTANISM) کی شکل اختیار نہیں کر سکی۔ پھر بھی ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلم معاشرے میں لبرل اور اصلاحی رجحانات کو پروان چڑھایا جو نتیجہ کے اعتبار سے معاشرے کو روایت پرستی کی گرفت سے نکالنے کی جانب ایک ضروری قدم تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسلم معاشرے میں ازمنۂ وسطیٰ کی فرسودہ قدروں کی جگہ انسان دوستی (Humanism) کی روایات کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اور لوگوں کو عقل پر اعتماد کرنا سکھایا[3]

ان کی تعلیمات کے زیر اثر مصر میں تاریخی شعور کو پنپنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ مسلم دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا ان دانشوروں میں قاسم امین

---

[1] فاذا ترتب على شيئ مفسدة فى زمن لم تكن تلحقه، فلا شك فى وجوب تغيير الحكم وتطبيقه على مقتضيات الحال الحاضرة، جرياً على قاعدة درء المفاسد مقدم على جلب المصالح" ایضاً: ۳۵۰

[2] آزادی نسواں پر قاسم امین نے دو اہم کتابیں لکھیں "تحریر المرأة" اور "المرأة الجديدة" یہ دونوں کتابیں مصر سے علی الترتیب ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئیں۔

[3] فرانسیسی مصنف (Lacouture) کے الفاظ میں (بقیہ حاشیہ ص ۶۱۹ پر)

علی عبدالرزاق اور طٰہٰ حسین وغیرہ کے نام کافی مشہور ہیں لیکن علمائے ازھر عموماً شیخ محمد عبدہ کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان لوگوں نے انہیں سلف کا دشمن قرار دیا۔ کافر کہا اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو ان کے خلاف بھڑکایا۔ یہ لوگ نہ صرف ان کی اصلاح پسندی کے دشمن تھے بلکہ وہ ان کے جوتوں کی وضع اور بالوں کی تراش پر بھی معترض تھے۔ جیسا کہ قاسم امین نے کہا ہے ان میں سے اکثر یوں اعتراض کرتے تھے۔ یہ کیسا شیخ ہے جو فرانسیسی زبان میں باتیں کرتا ہے، یورپ کا سفر کرتا ہے علمائے فرنگ کی تحریروں کا ترجمہ کرتا ہے۔ ایسے فتوے دیتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں دیئے تھے۔ امدادی انجمنوں میں حصہ لیتا ہے، غربا ومساکین کے لئے چندے جمع کرتا ہے۔ اگر یہ شخص اہل دین میں سے ہے تو اس کی جولانگاہ مسجد سے گھر تک ہونی چاہیئے۔ اگر وہ دنیا دار لوگوں میں سے ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس میدان میں تنہا سب سے زیادہ مصروف عمل ہے[1]

(بقیہ حاشیہ)

"With Muhammad Abdu, the spirit of enquiry broke into the closed world of Moslem thought. However shapeless his doctrine may seem, oddly reactionary sometimes and full of an optimistic naturalism which now looks old-fashioned, and however disconcerting his mixture of conformity with a boldness that threatened to undermine the faith itself, yet he offers the elements of the most important spiritual revolution.

Far though it is from the lofty humanism of Averroes or the energetic method of Ibn Khaldun, Muhammad Abduh's thought none the less broke the worst of shackles, that of the taqlid, the principle of authority and blind resignation to tradition, and so made possible to exercise intelligence.......

مختصر یہ کہ شیخ محمد عبدہ کو سب سے زیادہ خطرہ مصر کے ان ہی علمائے سوء سے تھا جو ہر طرح کی روشن خیالی کے دشمن تھے اور جن کے خلاف شیخ محمد عبدہ کو ساری عمر جہاد کرنا پڑا۔ جب وہ بستر مرگ پر تھے تو انہوں نے ان ناعاقبت اندیش علما کے خلاف اپنے خدشات کا ان الفاظ میں اظہار کیا:-

ولست أبالي أن يقال محمدٌ　　　أبل أم اكتظت عليه المآتم

ولكنه دين أردت صلاحه　　　أحاذر أن تقضي عليه العمائم

جس وقت سے محمد عبدہ جامعہ ازھر میں داخل ہوئے، برابر تصوف کے زیر اثر تھے۔ اور اس کے عملی پہلو میں زیادہ سے زیادہ مصروف رہتے تھے۔ دن کے وقت تحصیل علوم کے ساتھ ہی ساتھ روزہ رکھتے اور رات ادائے صلوٰۃ، تلاوت قرآن مجید اور اذکار و اشغال میں بسر کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے جسم کے ساتھ کھردرا کپڑا پہنتے اور دوسرے زاہدانہ اعمال بھی ملحوظ رکھتے۔ چلتے ہوئے اپنی آنکھیں نیچے رکھتے اور کسی سے بات نہ کرتے، سوائے اس حالت کے کہ اپنے معلمین اور دوسرے طلبہ سے گفتگو کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ وہ اپنے مطالعہ اور مراقبے اور ادب النفس میں ایسے مستغرق ہوتے کہ بعض اوقات دنیائے حواس سے ان کا رابطہ بالکل منقطع ہو جاتا اور وہ تخیل کی دنیا میں چلے جاتے، جہاں وہ اپنے خیال کے مطابق گزشتہ نسلوں کے انسانوں کی ارواح سے مشافہہ و مکالمہ کرتے، بالاخر وہ روحانی اعتبار سے ایسی حالت کو پہنچ گئے کہ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اس پر شیخ درویش نے جو انہیں تصوف کی زندگی میں لانے کے ذمہ دار تھے، انہیں دوبارہ فطری و طبعی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی۔

(اسلام اور تحریک تجدد مصر میں، از چارلس سی آدم)
مترجمہ عبدالمجید سالک)